نئی تہذیب۔۔۔سوالات کے جوابات

جواب 1 :اکبر نئی تہذیب کی برائیاں بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نئی تہذیب میں عورتیں بے نقاب پھریں گی۔لوگ اپنے پُرانے رسموں رواجوں کو فرسودہ سمجھیں گے اور یورپ کی اندھی تقلید سے ناکارہ ہوجائیں گے۔ اپنی روائتی زبانوں کو چھوڑ کر لوگ غیروں کی زبان بولیں گے اور دنیا سے پُرانی تہذیب یعنی شرافت اور سکون کم ہو جائے گا۔

جواب 2 : تقلید یورپ سے مُراد انگریزوں کے طرزِ عمل پر چلنا ہے۔لوگوں میں انگریزوں کی طرح بے حیائی کا دور شروع ہو گا۔

حوالہ: نظم "نئی تہذیب" اکبر الہ آبادی کی لکھی ہوئی ہے۔وہ 1846ء میں ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے اور 1921ء میں ان کی وفات ہوئی۔ اکبر نے غزلیں بھی لکھی ہیں لیکن ان کی انفرادیت ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں ہی نظر آتی ہے۔جو ان کی دائمی شہرت کا باعث بنی۔"نئی تہذیب" ایک طنزیہ نظم ہے جس میں زمانے کے بدلتے حالات پر طنز کیا گیا ہے۔

تشریح

1 : شاعر فرماتے ہیں کہ زندگی جینے کے موجودہ طریقوں کا اب کوئی وجود نہیں ہو گا۔ کیونکہ اب دنیا میں ایک نئی تہذیب اور اس کے نئے طریقے و نئے سامان ہوں گے۔

2 : شاعر فرماتے ہیں کہ اب عورتیں پردہ نہیں کریں گی۔عورتیں اب ان پرانے رواجوں (نقاب و برقع) کو چھوڑدیں گی اور نئے طریقوں (عریانیت) سے اپنی زینت دکھائی گی۔

3 : شاعر فرماتے ہیں کہ عورتیں پردہ کو اب بیکار اور فرسودہ تصور کریں گی اور نہ گھونگھٹ ہی اُن کا پردہ کر سکیں گے۔

4 : شاعر فرماتے ہیں کہ اب آسمان کی گردشوں سے لوگوں کی طبیعتیں بدل جائیں گی۔ اب نئے ڈھنگ کی خوشیاں اور غم کے نئے سامن ہونگے۔

5 : شاعر فرماتے ہیں کہ آنے والے دور میں بہت سے لوگ یورپ کی تقلید کا راگ الاپیں گے۔ مگر وہ اس قابل نہیں ہوں گے۔اس لئے وہ عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہونگے۔

: 6شاعر فرماتے ہیں کہ ہماری اپنی زباں کے قواعد سے لوگ نا آشنا ہوں گے۔ اس کے بر عکس ہماری عام بول چال میں بھی انگریزی الفاظ استعمال ہوا کریں گے۔

: 7 شاعر فرماتے ہیں کہ دنیا سے شرافت کا تصور ہی بدل جائے گا۔ اس وقت جس چیز کو بہت اور ٹھیک تصور کیا جاتا ہے کل اسی کو کم اور غلط کہا جائے گا۔

: 8شاعر فرماتے ہیں کہ دنیا اتنی تیزی سے بدل جائے گی کہ کسی کو اس کا احساس اور غم بھی نہیں ہو گا۔ جو چیزیں ہماری وراثتیں تھیں ہم ان ہی چیزوں اور رواجوں کو بھلا برا کہیں گے۔

: 9 آخری شعر میں شاعر خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے اکبر! تمہیں اس بدلتی ہوئی دنیا کا غم کیوں ہے۔ وہ دن بہت ہی قریب ہے جب دنیا میں تم رہو گے اور نہ ہم رہیں گے۔

پری محل۔۔۔سوالات کے جوابات

جواب 1 :شاعر کے نزدیک کشمیر میں بہار کی کیفیت جُنوں انگیز اور پُر کیف ہوتی ہے۔

جواب 2 :کشمیر میں ہر قدم پر پھولوں سے بھرے ہوئے باغ، دامنِ کہسار اور جھومتی گاتی ندیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے شاعر نے کشمیر کو گُل کدہ کہا ہے۔

جواب 3 :ہر قدم پر اہتمامِ رنگ و بو پھولوں سے بھرے ہوئے چمن کشمیر میں ہوتا ہے۔

حوالہ:شہہزور کشمیری کا اصلی نام غلام قادر ہے۔ اُن کا شمار کشمیر کے کہنہ مشق شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ 1915ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے اور 1990ء میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ تمام اصنافِ سخن پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ مگر نظم نگاری اُن کا خاص میدان تھا۔ نظم "پری محل" میں انہوں نے "پری محل" اور اس کے ارد گرد کے ماحول کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تشریح

پہلا بند: شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے کشمیر کی بہار کا وہ موسم یاد ہے جب وہاں کی نہروں کا رقص و نغمہ دیوانہ بنا دیتا تھا۔ چمن کی پاکیزگیاں اپنے دامن میں مستیاں لئے ہوئے تھیں اور بادلوں سے نشہ برستا تھا۔ بہار جیسے کسی نئی دلہن کو سنوار رہی تھی۔ فضا میں ہر طرف گلوں کے نغمے سنائی دیتے تھے اور بُلبلوں کی آوازیں نور برسا رہی تھیں۔

دوسرا بند: شاعر فرماتے ہیں کہ پری محل کے آس پاس پہاڑوں کے دامن خدا کا نور معلوم ہو رہے تھے۔ جس کو دیکھ کر جھیل ڈل کے کنول نکھرنے لگتے تھے۔ بہار کی مستی میرے سکونِ دل کو توڑ کر مجھے پری محل لے گئی۔ وہاں کی ہر چیز قابلِ نظارہ تھی۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ در پردہ جیسے کوئی چیز مجھے وہاں کا نظارہ کرنے سے روک رہی ہے۔

تیسرا بند: شاعر فرماتے ہیں کہ وہ چیز محل کے دروازے پر لٹکا ہوا تین سو سال پُرانا پردہ تھا۔ میرے شوقِ نظارہ نے ڈرتے ڈرتے آخر اس پردے کو ہٹا دیا۔ وہاں اندھیرا تو تھا مگر میرا شوق میرے لئے سحر کی روشنی ثابت ہوا اور اندر ایک چمکتا سورج سا روشن ہو گیا۔ وہاں عجب دبدبہ اور عجب شان تھی اور پردے کے پیچھے ایک وسیع محل اور اس کا ایوان تھا۔

چوتھا بند: شاعر فرماتے ہیں کی پری محل کے آس پاس کے پہاڑ سر سبز تھے اور وہ سونے جیسا محل اس طرح چمک رہا تھا جیسے کوہِ طور پر چمکنے والی بجلی اپنا جلوہ دکھا رہی ہو یا جیسے سبز جھاڑیوں میں کوئی رنگین تیتری بیٹھی ہو۔ کبھی وہ محل زمرّد کے باغ میں ناچتی ہوئے پری اور کبھی ایسا لگتا تھا کہ آسمان سے چاند زمین کے حسن کو دیکھنے آیا ہو۔ کیونکہ وہ محل کسی حسین کے ماتھے پر رنگین تِلک جیسا دکھائی دے رہا تھا۔

پانچواں بند: شاعر فرماتے ہین کہ یہ وہ خطۂ ارض ہے جہاں مقدس شراب کی بوندیں برستی ہیں۔ ہر وقت یہاں کل کھلتے رہتے ہیں اور بلبلیں چہکتی رہتی ہیں۔ ہوا کے جھونکے یہاں آہستہ آہستہ اور خوشبو پھیلا پھیلا کر چلتے ہیں اور فرشتے جنون میں آکر یہیں پر خدا کی وحدت کے گیت گاتے ہیں۔ یہ زمین کا ٹکڑا کسی شاعر کے خیالوں کی تصویر ہے یا حسین پریوں کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

چھٹا بند: شاعر فرماتے ہیں کہ اس پھولوں سے بھرے ہوئے چمن کی شام بے مثال اور لاجواب ہے۔ جیسے سنبلوں کی جنت کا ایک کھلتا گلاب ہے اور یہاں کی سحر اس آب و تاب سے آتی ہے جیسے کسی جنت کی حور کا جوشِ جوانی ہو۔ یہاں قدم قدم پر کلیوں کے کھلنے کا انتظام ہے اور ہر نیا پودا یہاں بہاروں کا جوش لیکر پھوٹتا ہے۔

مشرق و مغرب۔۔۔ سوالات کے جوابات

جواب 1 : مغرب و مشرق کی ہر بات ایک جیسی ہے کیونکہ دونوں کو ازل سے ایک ہی سوغات یعنی دل ملا ہے۔

جواب 2 :انسانوں میں نفرت پیدا کرنے والے لوگ سرمایہ دار اور ایسے افراد ہیں جو ظاہری طلسمات میں کھو گئے ہیں۔

جواب 3 :مغربی سرمایے کو میرے اور تیرے خون کی ارزانی اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ یہ مغرب و مشرق دونوں جگہوں کے مزدوروں اور کسانوں کے خون پسینے سے حاصل کیا گیا ہے۔

جواب 4 :اس شعر میں 'حرفِ حق' اور 'رسن و دار' کا رشتہ 'لذّت شوق' اور 'جرأتِ کردار' سے ملایا گیا ہے۔

حوالہ: یہ نظم علی سردار جعفری کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ 1913ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ادبی خدمات نثر اور نظم دونوں میدانوں میں ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہین۔ انسان دوستی، امن پسندی اور سماجی مساوات اُن کے اہم اور پسندیدہ موضوعات ہیں۔ یہ نظم بھی ایسے ہی جذبے کی تخلیق ہے۔

تشریح

1 : شاعر سرزمینِ یورپ سے کہتے ہیں کہ ایشیا والوں کو اپنا دشمن تصور نہ کر۔ کیونکہ ایشیا والوں اور یورپ والوں کو ازل سے ایک جیسا تجربہ عطا ہوا ہے اور اہ انمول تحفہ ایک دھڑکتا ہوا دل ہے۔

2 : شاعر فرماتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو لوٹ کر جس نے اُن پر ظلم کیا وہ مغرب کی زمین نہیں بلکہ مغرب کے سرمایہ دار ہیں۔

3 : شاعر فرماتے ہیں کہ سرمایہ دار نہ ہندوستانی ہوتا ہے اور نہ برطانی۔ بلکہ یہ مغرب اور مشرق کے مزدوروں اور کسانوں کے بہائے ہوئے خون پسینے کا صلہ ہوتا ہے۔

4 : شاعر فرماتے ہیں کہ جنگلوں میں پھرتی ہوئی ہوا کا گانا ایسا لگتا ہے جیسے کوئی راستہ بھولا ہوا مسافر زور زور آواز دے رہا ہو۔

5 : شاعر فرماتے ہیں کہ مغرب اور مشرق میں دونوں جگہ کلیاں حسینوں کے بالوں میں سجنے کے لئے کھلتی ہیں اور تتلیاں اِدھر سے اُدھر خوشبو کی تلاش میں اُڑتی ہیں۔

6 : شاعر فرماتے ہیں کہ دونوں جگہوں (مشرق و مغرب) میں پریاں موسم بدلتے ہی مچلنے لگ جاتی ہیں اور دونوں جگہ موسم بدلتے ہیں لوگوں کا لباس بھی بدل جاتا ہے۔

7 : شاعر فرماتے ہیں کہ دونوں جگہوں (مشرق و مغرب) کے راستے بچوں کے لئے اسکولوں کی طرف جاتے ہیں اور ننھے ننھے بچے باغوں میں کھیلتے ہوئے ایسے لگتے ہیں جیسے سبز گھاس میں کلیاں کھِل آئی ہو۔

: 8شاعر ارض مغرب سے کہتے ہیں کہ یہاں (ہندوستان) کی دیکھنے والی آنکھیں بھی سارے جہاں پر نظر رکھتی ہیں اور ہر نظر دیدار کے لطف کو حاصل کرنے کا شوق رکھتی ہے۔

: 9شاعر فرماتے ہیں کہ لندن اور پیرس کے کاریگروں، فنکاروں اور روم و یونان کے بُت کاروں کا بھلا ہو۔ کیونکہ انہوں نے دنیا کے سامنے اپنے فن کے بہترین نمونے اور شہکار پیش کئے ہیں۔

: 10شاعر ارضِ مغرب سے کہتے ہیں کہ تمہارے بازاروں میں یوسف جیسے حسین بھی ہیں اور اُن کی قدر و منزلت سمجھنے والی زلیخائیں بھی ہیں اور تمہارے ویرانوں میں محبت کے جذبے سے سرشار مجنوں بھی ہیں اور لیلائیں بھی ہیں۔

: 11شاعر ارضِ مغرب سے کہتے ہیں کہ تمہارے یہاں اور ہمارے ہاں دونوں جگہ دولت مند لوگ بھی رہتے ہیں اور غریب بھی۔ دونوں جگہوں پر زرق برق لباس پہنے ہوئے لوگ رہتے ہیں اور غریب ننگے لوگ بھی۔

12شاعر فرماتے ہیں کہ دونوں جگہوں پر سچ کے لئے اپنی جان دینے والے لوگ بھی رہتے ہیں اور اُن کے کے لئے پھانسی کا تختہ بھی ہے۔ اپنے شوق کو ہر قیمت پر پورا کرنے والے لوگ یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی۔ دونوں جگہوں پر کردار کے غازی موجود ہیں اور ہم میں کوئی فرق نہیں۔

: 13شاعر فرماتے ہیں، اصلیت یہی ہے کہ ہم حقیقت سے اپنی آنکھیں چُرا کر دنیا کی ظاہری جادوگریوں میں کھو جاتے ہیں۔

: 14شاعر فرماتے ہیں کہ اسی لئے ہم نفرت کا زہر پی کر انسانوں کو رنگ و نسل میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہم انسانی برابری سے ناآشنارہ جاتے ہیں۔

"قبر"۔۔۔سوالات کے جوابات

جواب 1 :شاعر نے رئیس کے بیٹے کی زبانی قبر کی زندگی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ قبر میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ وہاں روشنی کا کوئی گزر نہیں ہوتا۔ وہاں نہ کھانا ہوتا ورنہ پانی۔ انسان وہاں ہر چیز کے لئے ترستا ہے اور وہاں جو بھی گزرے وہ انسان کو اکیلے سہنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہاں کوئی مونس و غمخوار نہیں ہوتا۔

جواب 2 :غریب کے بچےکو قبر کی باتیں سُن کر اپنا گھر اس لئے یاد آیا کیونکہ قبر کے حالات اس کے گھر کی مفلسی کے حالات سے ملتے تھے یعنی غریب کے گھر کی زندگی قبر کے حالات سے بھی گئی گزری تھی۔

جواب 3 :اگر اس نظم سے آخری دو مصرعے نکال دیئے جائیں تو یہ نظم محض ایک قصِہ معلوم ہو گی۔ کیونکہ غریب کے گھر اور قبر کی دنیا میں رشتے کی معنویت ان ہی دو مصرعوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

حوالہ: یہ نظم اختر الایمان کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ 1915ء کو بجنور میں پیدا ہوئے۔ وہ اردو نظم کے ممتاز شاعر ہیں اور اس کے ارتقا میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے غریبی کی زندگی کو پیش کرنے کے لئے قبر کے حالات کا سہارا لیا ہے اور ان حالات کو انہوں نے ایک قصے کی شکل میں بیان کیا ہے۔

تشریح

شاعر فرماتے ہیں کہ یہ قصہ ایران کے ایک شہر کا ہے جہاں ایک بہت بڑا رئیس رہتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے وہ بیمار ہو گیا۔ اس نے ہر ممکن علاج کیا مگر کوئی صورت کار گر نہ ہوئی۔ وہ پیروں، فقیروں کے پاس بھی گیا مگر سب بے سود۔ خدا کو جو منظور تھا وہی ہو کے رہا یعنی وہ اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے مرنے کی خبر فوراً ہر طرف پھیل گئی۔ نزدیک و دور سے بہت سے لوگ اس کے جنازے میں شریک ہونے آئے۔ اس کا جنازہ اُٹھا تو اس جنازے کے ساتھ اُس رئیس کا بیٹا بھی تھا۔ جو اپنے باپ کی جدائی میں بے حال ہو رہا تھا وہ بار بار اپنے باپ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔" اے میرے والد! تم ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہے ہو جہاں تمہارا کوئی مونس و غمخوار نہیں ہو گا۔ تمہیں ایسی اندھیری کوٹھری میں تہنا ہے جہاں تمہیں کھانا پانی کچھ نہیں ملے گا۔ وہاں تم پر جو کچھ گزرے گی تمہیں وہ اکیلے سہنا ہے۔ تم وہاں ہر چیز کو ترسو گے "اس جنازے میں ایک مجلس آدمی بھی اپنے بیٹے کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے بیٹے نے جب یہ باتیں سُنیں تو مُڑ کر اپنے باپ سے بڑی سادگی سے پوچھا کہ ابا جان! کیا یہ لوگ اس آدمی کو ہمارے گھر لئے جاتے ہیں۔

پرندے کی نصیحت۔۔۔سوالات کے جوابات

جواب 1 :پرندے کی گفتگو سن کر شکاری نے پرندے کے پر کھول دیئے۔

جواب 2 :آدمی جب عاجز ہو تو اُسے ہمت سے کام لینا چاہئے۔

جواب 3 : پرندہ آزاد ہوتے ہی نزدیکی درخت کی ایک شاخ پر بیٹھ کر چہکنے لگا۔

حوالہ: یہ مثنوی دیا شنکر نسیم کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ 1812ء میں پیدا ہوئے اور 1844ء میں اُن کی وفات ہوئی۔
انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں مگر اُن کی شہرت مثنوی ہی سے ہوئی۔ مثنوی کا جو حصہ ہمارے سامنے ہیں
اُس میں ایک پرندہ شکاری کو اپنی نصیحت سے فریب دیتا ہے اور شکاری اُسے آزاد کر دیتا ہے۔

تشریح

شاعر فرماتے ہیں:۔

: 1 ایک چمن میں رہنے والا ایک عقلمند پرندہ شکاری کا قیدی بن گیا۔

: 2 جب شکاری نے اس کے پر باندھے تو پرندے نے اُس سے کہا کہ تو مجھے کس لالچ میں بند کر رہا ہے۔

: 3 پرندہ شکاری سے کہتا ہے کہ اگر تو مجھے بیچ دے تو تمہیں چند روپے ملیں گے اور اگر مجھے ذبح کر دو گے تو تھوڑا سا گوشت ملے گا۔

: 4 اگر تم مجھے پالو گے تو کبھی نہ کبھی میں تمہیں چھوڑ کر چلا ہی جاؤں گا اس لئے اگر تم عقلمند ہو تو مجھ سے میری قیمت وصول کر لو۔

: 5 پرندہ شکاری سے کہتا ہے کہ میرے پَروں کو باندھنے کے بدلے تو میری نصیحت کو اپنے دماغ میں اُتار لے۔

: 6 پرندہ شکاری سے کہتا ہے کہ کوئی تم سے کچھ بھی کہے مگر کرنا وہی چاہئے جو خود کو اچھا لگے۔

: 7 اگر کوئی چیز تمہارے قبضے میں ہو تو اُس سے غافل نہ رہو اور اگر کسی چیز کو حاصل کرنے سے تم قاصر ہو تو ہمت نہ ہارو۔

: 8 پرندہ شکاری سے کہتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اُسے ہاتھ سے نہ جانے دو اور جو تمہارے پاس نہیں ہے اُس کا افسوس نہ کرو۔

: 9 جب شکاری نے پرندے کی باتیں سُنیں تو وہ اس کا قائل ہو گیا۔

: 10 شکاری نے پرندے کو کھول دیا اور پرندے نے اپنے پر پھیلائے۔

: 11 پرندہ پاس ہی ایک پیڑ کی ٹہنی پر بیٹھ گیا اور شکاری نے کہا کہ تم نے میرے پر کس لئے کھولے۔

: 12 میری ہمت اور تمہاری غفلت نے مجھے آزاد کر دیا۔

: 13 پرندہ شکاری سے کہتا ہے کہ تمہارے نصیب میں دولت نہیں تھی کیونکہ میرے پیٹ میں ایک موتی تھا۔

: 14 شکاری نے پھر چاہا کہ کسی دھوکے سے پرندے کو قید کرلے۔

: 15 شکاری پرندے سے کہتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو کیونکہ پرندے کبھی ہیرے نہیں نگلتے۔

: 16 کسی کی بھی بات پر جلدی سے یقین نہ کیا کرو بلکہ پہلے خود سوچا کرو۔

بے نظیر کے نہ ہونے پر باغ کی ویرانی۔۔۔سوالات کے جوابات

جواب 1 : نخلِ ماتم سے مراد وہ بیل بوٹے ہیں جو تابوت پر بنائے جاتے ہیں۔

حوالہ: یہ مثنوی میر حسن کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ 1727ء میں پیدا ہوئے اور 1786 میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جن کے ہاتھوں اُردو زبان و ادب کی بڑی بڑی خدمات انجام پائیں۔ مثنوی کے اس حصے میں اس وقت کا بیان ہے جب شہزادہ بے نظیر باغ سے غائب ہو جاتا ہے اور اُس کے چاہنے والوں کو باغ ویران نظر آنے لگتا ہے۔

تشریح

شاعر فرماتے ہیں:۔

: 1 جب وہ دراز قد (شہزادہ بے نظیر) اس باغ سے چلا گیا تو اُس کے غم میں پھول ماتم کرنے لگے اور وہ سیاہ دھبے سے نظر آنے لگے۔

: 2 قمریاں وہ سارا غرور بھول کر جو شہزادے کے دم سے قائم تھا ماتم کرنے لگیں۔

: 3 باغ کے ننھے ننھے پیڑ پودے شہزادے کے غم میں سوکھ کر زرد ہو گئے۔ پھل خشک ہو گئے اور پتے پامال ہو گئے۔

: 4 باغ کی کلیاں غم سے مسکرانا بھول گئیں اور لہو کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئیں۔

: 5 غم سے روتے روتے نرگس کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی اور سنبل نے خود کو ماتم کی رات میں تبدیل کر دیا۔

: 6 نہر کے کنارے گرد و غبار اُڑنے لگا اور "گل اشرفی" کا رنگ زرد ہو گیا۔

: 7 اُس باغ میں ایسا ماتم ہونے لگا کہ سارے درخت ان بیل بوٹوں کی طرح لگتے تھے جو تابوت پر بنائے جاتے ہیں۔

: 8 تمام درختوں کے پتے آپس میں ہاتھ رگڑ رگڑ کر اظہار افسوس کر رہے تھے۔

: 9 اُس باغ میں جو پانی کی نہر بہہ رہی تھی وہ آنکھو کے آنسوں بن کر رہ گئی۔

: 10 اس باغ میں جس جگہ مور ناچا کرتے تھے اب اُس جگہ کوے بولتے تھے۔

: 11 باغ کے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھنے میں جو لطف پہلے محسوس ہوتا تھا وہ لطف اُس باغ میں کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

: 12 وہاں جو نقش دار رنگین مکان تھے وہ سب کے سب خون بہاتی آنکھوں جیسے لگتے تھے۔

: 13 وہاں پھولوں کی طرح کھلے ہوئے جو دل تھے وہ سب جدائی کی خزاں سے پریشان دکھائی دیتے تھے۔

: 14 وہاں نہ کلیاں رہیں نہ پھول اور نہ وہ باغ ہی رہا۔ صرف دل میں جدائی کا ایک کانٹا چُبھتا رہا۔

: 15 شہزادرے کے غم میں سب نے اپنے گریبانوں کو پھولوں کی طرح چاک کرکے ادھر اُدھر پھینک دیا۔

رباعیات جگت موہن لال رواں

حوالہ: یہ رباعیات جگت موہن لال رواں کی لکھی ہوئی ہیں۔ وہ 1889ء میں اُترپردیش میں پیدا ہوئے اور 1934ء میں ان کی وفات ہوئی۔ اُن کی رباعیات میں مضامین کی رنگارنگی اور معنی کی آفرینی پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ اردو شاعری میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تشریح

پہلی رباعی: اس رباعی میں شاعر نفس کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زندگی میں نہ غریبی کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ امیری۔ انسان کو صرف ایسی ہی باتوں سے لگاؤ رکھنا چاہئے جو اس کے نفس کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوں۔ جو آرام نفس کی اصلاح میں مددگار نہ ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان ایسی مصیبت کا شکار رہے جو نفس کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوں۔

دوسری رباعی: اس رباعی میں شاعر فرماتے ہیں کہ میری زندگی گناہوں سے بھری ہوئی ہے اور میں اسی قابل ہوں کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا ملے۔ میں نے خود اپنے نفس کے جال میں پھنس کر بہت گناہ کئے ہیں ۔کسی اور کی شکایت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ کیونکہ میں خود اپنے آپ کا سب سے بڑا دشمن ہوں۔

تیسری رباعی: اس رباعی میں شاعر فرماتے ہیں کہ روح کو ازل سے ایک ایسا غم ملا ہے جو کبھی اس کا دامن نہیں چھوڑتا۔ اس لئے انسان کی طبیعت اصلی کوشیوں سے ہر پل محروم ہی رہتی ہے۔ انسان کا دل کبھی بھی خالی نہیں رہتا۔ اگر امید چلی جاتی ہے تو نااُمیدی آکر اس میں بس جاتی ہے۔

رباعیات سید احمد حسین امجد

حوالہ: یہ رباعیات سید احمد حسین امجد کی لکھی ہوئی ہیں۔ وہ 1880ء میں پیدا ہوئے اور 1960ء میں ان کی وفات ہوئی۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی شہرت قطعات اور رباعی کی بدولت ہوئی۔ اُن کی رباعیات میں سادہ اور عام فہم زبان استعمال ہوئی ہے اور تصوّف و اخلاقیات اُن کے خاص موضوعات ہیں۔

تشریح

پہلی رباعی: شاعر وحدتِ الٰہی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کائنات کے زرّے زرّے میں خدا کو نور بسا ہوا ہے اور ہر بت یعنی ہر انسان میں خدا کی شان نظر آتی ہے۔ کائنات کی ہر شے میں خدا کی قدرت بسی ہوئی ہے بالکل اُسی طرح جیسے اعداد مختلف ہیں۔ ان کی قیمت اور شکلیں الگ الگ ہیں مگر اُن میں اکائی ضرور ہوتی ہے۔

دوسری رباعی: شاعر فرماتے ہیں کہ بچپن کے ختم ہوتے ہی جوانی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ دراصل کسی چیز کا ہونا ہی اُس کا فنا ہو جانا ہے۔ یعنی جب کوئی چیز موجود ہو تبھی وہ فنا ہو جاتی ہے۔ ہماری یہ سوچ سراسر غلط ہے کہ روح انسانی اور وجودِ انسانی الگ الگ چیزیں ہیں۔ حقیقت میں یہ دونوں چیزیں ایک ہیں کیونکہ جو چیز ہمیں برف نظر آتی ہے حقیقت میں وہ پانی ہے۔

تیسری رباعی: شاعر فرماتے ہیں کہ کسی چیز کا کھو جانا بھی انسان کے لئے ایک طرح کی راحت ہے کیونکہ انسان تبھی آرام سے سو سکتا ہے جب اُسے کسی چیز کی کوئی فکر نہ ہو۔ غریبی نے میرے لئے سخت موت کو بھی آسان کر دیا۔ کیونکہ جان نکلتے وقت مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ دولت کا نہ ہونا بھی انسان کے لئے بڑی دولت اور نعمت اور راحت کی بات ہے۔

Compiled by Suhail Mahdi

For Green Valley Educational Institute